OPEN ACCESS
RUSHD
(Bi-Annual Research Journal of Islamic Studies)
Published by: *Lahore Insititute for Social Scicnces, Lahore.*

ISSN (Print): 2411-9482
ISSN (Online): 2414-3138
Jan-June-2023
***Vol:* 4, *Issue:* 1**
journalrushd@gmail.com**Email:**
OJS: https://rushdjournal.com/index

Dr Jawwad Haidar[1]

Dr Hafiz Tahir Islam[2]

فقہی تعبیرات میں روایت و جدیدیت کی کشمکش؛ ”مسئلہ عول“ کا اختصاصی مطالعہ

Conflict between tradition and modernity in jurisprudential interpretations; A specific study of the "Problem of *Awl*."

Abstract

Traditionalism and modernism are two contrasting ideologies that significantly impact various aspects of human life, including the realm of Islamic law (fiqh). Traditionalism entails a profound reverence for traditional and religious values, while modernism rejects established norms and places greater emphasis on individual experiences. The clash between these two ideologies becomes apparent in several areas of Islamic fiqh, one of which is the concept of 'Aloul' in inheritance. While all Islamic scholars agree on the legality of 'Aloul' in Islam, Mr. Javed Ahmad Ghamidi holds the view that it contradicts the Quranic perspective. This research aims to explore and critique Ghamidi's concept, shedding light on the

1 Lecturer, Government Degree College, Renala Khurd
2 Assistant Professor, Allama Iqbal Open University, Islamabad

differences between traditional Islamic perspectives and the modernist interpretation advocated by Ghamidi.

Keywords: Javed Ahmed Ghamidi, Awl, Warasat, Modernism

روایت اور جدیدیت کا دوسرا نام وابستگی اور ناوابستگی ہے۔ بدلتے حالات، متغیر افکار اور متبدل زمان و مکان میں ماقبل فکر و عمل کی رعایت روایت پسندی کہلاتی ہے، جبکہ نئی راہوں کی استعجابیوں، بدلتے احوال کی نیرنگیوں اور سلگتے موضوعات کی رعنائیوں کے سبب نئے فکر و فلسفہ اور جدید اعمال و افعال کی تخلیق جدیدیت سے موسوم ہے۔

"آزادی" جدیدیت کا بنیادی اصول ہے، جسے اس کے حاملین زندگی کے تمام شعبوں میں برتتے ہیں۔ حتیٰ کہ فقہی استدلالات میں بھی نئے پیمانے وجود میں لائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس "وابستگی" روایت پسندی کا بنیادی اصول ہے، جسے فقہی احکام میں بھی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ فقہی تعبیرات میں جدیدیت اور روایت پسندی کی کشمکش "مسئلہ عول" سے بڑی حد تک نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ جدیدیت سے متصف ہر مفکر چونکہ جداگانہ اصول اور منفرد اسلوب کا حامل ہوتا ہے، اس لیے مسئلہ عول کے اختصاصی مطالعہ کے لیے ایک سے زائد مفکرین کے بجائے محض محترم جاوید احمد غامدی صاحب کی آراء کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

روایت پسندوں کے ہاں قرآن مجید کے اولین مخاطبین یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید کی زیادہ بہتر تفہیم رکھتے تھے، کیونکہ قرآن مجید ان ہی کی زبان میں نازل ہوا؛ ان کا استدلال مضبوط اور زبان دانی سب سے اعلیٰ تھی؛ وہ وحی کے مزاج آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور عدل و انصاف جیسے اعلیٰ اوصاف سے بھی متصف تھے۔ نیز ان کے قرآنی فہم اور اجتہادات پر اجماع ان کی آراء کو کو شرعی بنیاد بھی فراہم کر دیتا ہے، جس سے عدول کسی بھی مسلمان کے لیے کسی طور گوارا نہیں ہو سکتا۔ دوسری جانب جدیدیت کے قائلین کے ہاں قرآن مجید ہر دور میں اسی طرح زندہ و جاوید معجزہ ہے جیسے اپنے اولین مخاطبین کے لیے تھا، اس لیے دورِ جدید کے لوگ بھی اس کے اسی طرح مخاطب ہیں جیسے پہلے لوگ تھے، ماقبل لوگوں کی تفہیم کوئی شرعی دلیل نہیں، بھلے سب اس پر متفق ہوں۔

عول کے جواز کے قائلین کے ہاں یہ مسئلہ جہاں قرآن مجید سے ثابت ہے، وہاں عام عقلی اصولوں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اور اجماع جیسی مضبوط بنیاد بھی رکھتا ہے۔ اس کے برعکس محترم جاوید احمد غامدی صاحب کے ہاں قرآن مجید کے قائم کردہ حصص میں کمی بیشی جائز نہیں، ان کے ہاں کلام کی تالیف اس طرح نہیں ہے

جیسے آج تک سمجھا گیا ہے، ان کے نزدیک آیاتِ میراث کی درست تفہیم یہ ہے کہ پہلے والدین اور خاوند یا بیوی کو ان کا حصہ دیا جائے پھر اولاد میں حصے تقسیم کیے جائیں تو عول کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مسئلہ عول پر بنیادی اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ قرآن مجید میں بیان کردہ حصص میں تبدیلی ہے۔ زیر نظر تحریر میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسئلہ عول قرآنی احکام کی ایک تطبیقی شکل ہے، جس کے بغیر عدل وانصاف کے پیمانے قائم رکھنا ممکن نہیں۔ انطباق کا یہ طریقہ نہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اجماعِ امت سے ثابت شدہ ہے، بلکہ اس بارے قرآن مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ میں بھی اشارات ملتے ہیں۔ مزید برآں قیاسِ صحیح بھی اسی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

اس تحقیق کے نتیجے میں یہ بات بھی کھل کے سامنے آجاتی ہے کہ کس طرح اپنے سمجھے ہوئے مفہوم کو قرآن مجید کا حتمی مفہوم، بلکہ اصل قرآن کہا جاتا ہے اور پھر اس مفہوم سے ٹکراتی احادیث، اقوالِ صحابہ، قیاسِ صحیح اور اجماع تک کو رد کر دیا جاتا ہے۔

مسئلہ عول:

لغوی طور پر لفظ عول کے کئی ایک معانی ہیں، ان میں سے ایک معنی زیادتی یا بلندی ہے۔ اصطلاحی طور پر عول کہتے ہیں: "زِيَادَةٌ فِي السِّهَامِ، وَنُقْصَانٌ فِي أَنْصِبَاءِ الْوَرَثَةِ"[1] ورثا کے مجموعی حصص میں زیادتی اور فرضی حصوں میں کمی واقع ہونا۔

مثال کے طور پر اگر کسی میت کے ورثاء میں ماں، شوہر اور بیٹی موجود ہوں تو ماں کا حصہ: 1/6، شوہر کا حصہ: ½، بیٹی کا حصہ: ½ ہو گا۔ اصل مسئلہ 6 ہو گا، لیکن ماں کا حصہ 1، شوہر کے 3 اور بیٹی کے بھی 3 ہونے کے بناء پر عول واقع ہوا، لہذا اب مسئلہ 6 کے بجائے 7 سے حل ہو گا۔

- یاد رہے کہ ترکے کی تقسیم میں تین صورتوں میں سے ایک صورت کا لازماً سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلی یہ کہ ترکہ ورثاء کے حصوں پر پورا پورا تقسیم ہو جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ ترکہ ورثاء کے حصص سے کم ہوتا ہے

1 الفيومي، أحمد بن محمد بن علي الفيومي، المصباح المنير (القاهرة: دار المعارف، 2016)، 2: 438
Al-Fayyumi, Ahmad bin Muhammad bin Ali Al-Fayyumi, Al-Misbah al-Munir (Cairo: Dar al-Ma'arif, 2016), 2: 438.

اور تیسری صورت یہ ہے کہ ترکہ ورثاء کے حصص سے زائد ہوتا ہے۔ پہلی صورت پر غامدی صاحب بھی متفق ہیں، البتہ دوسری صورت میں غامدی صاحب کے نزدیک عول کے طریقے کو اختیار کرنے سے قرآن کے بیان کردہ حصص میں فرق آجاتا ہے۔ لیکن تیسری صورت میں جب ورثاء کو ان کے قرآن مجید میں بیان کردہ حصص سے زائد دیا جاتا ہے تو غامدی صاحب کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

عول کے جواز کے قائلین اور ان کے دلائل

سب سے پہلے فرائض کے ماہر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے میراث میں عول اختیار کیا۔ پھر امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی موافقت فرماتے ہوئے اصحاب الفروض کے حصص کی کثرت کی بناء پر عول کے ذریعے مسئلے کا حل پیش کیا۔[1]

اس مسئلے میں کسی صحابی نے بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت نہیں کی، اس لیے اس پر اجماع منعقد ہو گیا، جسے اجماعِ سکوتی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اس مسئلے میں ان سے اختلاف کا اظہار فرمایا۔ تفصیل بعد میں آرہی ہے۔

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" ولا نعلم اليوم قائلًا بمذهب ابن عباس، ولا نعلم خلافًا بين فقهاء الأمصار في القول بالعول، بحمد الله ومنه."[2]

"آج سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موقف کا کوئی قائل ہمارے علم میں نہیں اور فقہاء الامصار میں عول کے جواز سے متعلق کسی اختلاف سے بھی ہم آگاہ نہیں ہیں۔ (گویا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے) الحمد للہ ومنہ۔"

---

1 ابن قدامة، عبد الرحمن بن محمد بن محمد بن أحمد بن جبير الفهري الأندلسي الشافعي، المغني لابن قدامة (مكتبة القاهرة، 1968م)، 9 : 28

Ibn Qudamah, Abdul Rahman bin Muhammad bin Muhammad bin Ahmed bin Jubair Al-Fahri Al-Andalusi Al-Shafi'i, Al-Mughni li Ibn Qudamah (Maktabat al-Qahira, 1968), 9: 28

2 أيضاً: 9: 30

Ibdi, 9:30

مذاہب اربعہ حنفیہ،[1] مالکیہ،[2] شافعیہ[3] اور حنابلہ[4] سبھی عول کے جواز کے قائل ہیں۔

قائلینِ عول کے دلائل:

1۔ قرآنی نصوص کا عموم:

قرآن مجید میں ایک بیٹی کا حصہ نصف، دو یا زائد بیٹیوں کا دو تہائی، خاوند کا آدھا یا چوتھائی، بیوی کا چوتھائی یا آٹھواں، ماں کا چھٹا یا تیسرا، والد کا چھٹا اور دیگر حصص بیان ہوئے ہیں۔[5] چونکہ قرآن مجید نے ورثاء کے حصص بڑی وضاحت سے بیان کر دیئے ہیں، اس لیے اپنے ذاتی فہم، ذوق یا وجدان سے کسی کو مقدم یا موخر نہیں کیا جاسکتا، نہ ہی کسی کو کلی یا جزوی طور پر محجوب کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اگر ورثاء کے ازدحام کے سبب ان کے حصص بڑھ جائیں تو اپنے اجتہاد سے کسی کا پورا اور کسی کا حصہ کم کرنے کے بجائے انصاف یہ ہو گا کہ تمام ورثاء کو ان کے حصص کے مطابق مال دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے حصے کے بقدر مال میں ان کا حصہ کم کر دیا جائے گا۔

2۔ اللہ تعالیٰ کی سنت:

قرآنی آیات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ورثاء بڑھ جانے کے نتیجے میں حصص میں کمی کرنا اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ مثال کے طور پر ایک بیٹی کا حصہ نصف بیان ہوا ہے۔ ﴿وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾[6] اگر وہ

---

1 ابن عربي، محمد بن عبد الله أبو بكر بن العربي، احكام القرآن (بيروت : دار الكتب العلمية، 2003م)، 3: 22

Ibn Arabi, Muhammad bin Abdullah Abu Bakr bin Al-Arabi, Ahkam al-Quran (Beirut: Dar al-Kutub al-Ilmiyyah, 2003), 3: 22.

2 السيوطى، جلال الدين السيوطي، الشرح الكبير، 4: 471

Al-Suyuti, Jalal al-Din al-Suyuti, Al-Sharh al-Kabir, 4: 471.

3 شمس الدين، محمد بن محمد، مغني المحتاج (بيروت: دار الكتب العلمية، 1994م):3: 32

Shams al-Din, Muhammad bin Muhammad, Al-Mughni al-Muhtaj, 3: 32.

4 ابن قدامة، عبد الرحمن بن محمد بن محمد بن أحمد بن جبير الفهري الأندلسي، المغنى لابن قدامة: 9: 28

Ibn Qudamah, Abdul Rahman bin Muhammad bin Muhammad bin Ahmed bin Jabeer al-Fahri al-Andalusi, Al-Mughni by Ibn Qudamah: 9: 28.

5 النساء: 11، 12، 176

Al-Nisa:11,12,176

6 النساء: 11

اکیلی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے۔ جو کہ پچاس فیصد بنتا ہے۔ جبکہ دو یا دو سے زائد بیٹیاں ہوں تو ان کے لیے دو تہائی ہے۔ ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾[1] پس اگر وہ عورتیں دو یا دو سے زائد ہوں تو ان کے لیے میت کے چھوڑے ہوئے مال کا دو تہائی ہے۔ اگر بیٹیاں دو ہوں تو ایک کا حصہ تینتیس اعشاریہ تینتیس فیصد بنتا ہے، اگر زیادہ ہوں تو اس سے بھی کم ہوتا چلا جائے گا۔ گویا ورثاء زیادہ ہونے کی صورت میں ان کے حصص میں کمی کرنا اللہ تعالیٰ نے خود انسانوں کو سکھایا ہے۔ اسی طرح اولاد کی عدم موجودگی میں والدین اور خاوند بیوی کا زیادہ حصہ بیان ہوا اور اولاد کی موجودگی میں والدین اور خاوند بیوی کا حصہ خود اللہ تعالیٰ نے کم کر دیا ہے۔ اسی طرح بیویاں زیادہ ہوں تو ربع یا ثمن میں شریک ہو جاتی ہیں، یوں ان کا متعین حصہ کم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عام اصول ہے، جسے معمولی بصیرت کا حامل شخص بآسانی سمجھ لیتا ہے۔ اسی دلیل سے عول کو سمجھنا بھی مشکل نہیں رہتا۔

3۔ احادیث کا عموم:

نبی کریم ﷺ اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں عول کا مسئلہ تو پیش نہیں ہوا، اس لیے ان ادوار میں اس سے متعلق ان سے کوئی صریح دلیل نہیں ملتی، البتہ احادیث کا عموم اس پر کافی دلیل ہے، جن میں حجبات کے سوا کہیں بھی بعض اصحاب الفروض کو بعض پر مقدم نہیں کیا گیا۔ حدیث مبارکہ میں یہ بیان ہوا ہے: "أَلْحِقُوا الفَرائِضَ بأَهْلِها، فَما بَقِيَ فَلِأَوْلى رَجُلٍ ذَكَرٍ"[2] مقررہ حصے ان کے اہل کو دے دو، جو باقی ہو وہ قریبی مرد کے لیے ہے۔

یہ حدیث مبارکہ تقدیم و تاخیر میں نص ہے، یعنی جس کو مقدم کرنا تھا اسے مقدم کر دیا گیا ہے یعنی اصحاب

Al-Nisa:11

1 النساء: 11

Al-Nisa:11

2 البخاري، أبو عبد الله محمد بن إسماعيل البخاري، صحيح البخاري (بيروت: دار ابن كثير، 2002م)، رقم الحديث: 6732؛ مسلم، مسلم بن الحجاج، صحيح مسلم (المدينة المنورة: دار طيبة، 2006)، رقم الحديث:4141

Al-Bukhari, Abu Abdullah Muhammad bin Ismail al-Bukhari, Sahih al-Bukhari (Beirut: Dar Ibn Kathir, 2002), Hadith number: 6732; Muslim, Muslim bin al-Hajjaj, Sahih Muslim (Al-Madinah Al-Munawwarah: Dar Tayyibah, 2006), Hadith number: 4141

الفروض اور جسے موخر کرنا تھا، اسے موخر کر دیا گیا ہے، یعنی عصبات۔ اگر حجبات کے علاوہ اصحاب الفروض میں تقدیم و تاخیر روا ہوتی تو اسے بھی بیان کر دیا جاتا، لیکن ہمیں ایسا نہیں دکھائی دیتا۔ گویا یہ حدیث مبارکہ خود ساختہ تقدیم و تاخیر کو رد کر دیتی ہے۔ نیز اصحاب الفروض کے ازدحام کی صورت میں اس حدیث مبارکہ پر تب تک عمل ممکن نہیں جب تک عول کو اختیار نہیں کر لیا جاتا۔

نیز نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد کی بیٹیوں سے متعلق فرمایا:

"أَعْطِ ابْنَتَيْ سَعْدٍ الثُّلُثَيْنِ، وَأَعْطِ أُمَّهُمَا الثُّمُنَ، وَمَا بَقِيَ فَهُوَ لَكَ"[1]

"سعد رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں کو دو تہائی اور ان کی ماں کو آٹھواں دو اور جو باقی بچے وہ تمہارا (چچا کا) ہے۔"

اس میں نبی کریم ﷺ نے کل مال میں سے دو تہائی بیٹیوں کو دلایا ہے اور چچا کے لیے باقی ہے۔ گویا تقدیم و تاخیر کی نبوی تقسیم یہی ہے کہ اصحاب الفروض کو پہلے دیا جائے اور عصبہ کو بعد میں۔ اگر اصحاب الفروض کے اندر تقدیم و تاخیر کی گنجائش ہوتی تو نبی کریم ﷺ اسے بھی بیان فرما دیتے۔ یہ حدیث ان لوگوں پر رد ہے جو اولاد کو مؤخر کرتے ہوئے باقی بچے مال میں سے دینے کے قائل ہیں۔ گویا اصحاب الفروض میں جب خود ساختہ تقدیم و تاخیر نہیں ہو گی تو ان کے سہام بڑھ جانے کی واحد مبنی بر عدل صورت "عول" ہی باقی بچتی ہے۔

4۔ اقوالِ صحابہ

کتب اصول میں شریعتِ اسلامیہ کا ایک ماخذ قولِ صحابی بھی مذکور ہے۔ نصوص سے متعلق صحابہ کا بدیہی فہم یقیناً حجت ہے، کیونکہ قرآن مجید انہی کی زبان میں نازل ہوا، اور اگر وہ ہی اسے سمجھنے سے قاصر رہے تو یہ قرآن مجید کے غیر بلیغ ہونے پر دلیل ہو گا، جو کہ خلافِ واقع ہے۔ البتہ صحابہ کرام کے اجتہادات سے متعلق اہلِ علم کی آراء مختلف ہیں کہ یہ ماخذِ شریعت ہیں یا نہیں؟ اس کی تفصیل کتبِ اصول میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ورثاء کے سہام کا مجموعہ بڑھ جانے کی صورت میں ان کے حصص میں کمی کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال سے ثابت ہے۔ جیسا کہ سیدنا زید بن ثابت، سیدنا عمر بن خطاب، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم و دیگر کا قول ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کسی

---

1 التِّرْمِذِي، محمد بن عيسىٰ، جامع الترمذي (بيروت: دار الغرب الإسلامي، 1996)، رقم الحديث:2092
At-Tirmidhi, Muhammad bin Isa, Jami` at-Tirmidhi (Beirut: Dar al-Gharb al-Islami, 1996), Hadith number: 2092.

نے بھی ان سے اختلاف نہیں کیا، البتہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے عول کا فتویٰ دیا:

"عَنْ خَارِجَةَ بْنِ زَيْدٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ أَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ عَالَ فِي الْفَرَائِضِ"[1]

"خارجہ بن زید رحمۃ اللہ علیہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے متعلق بیان فرماتے ہیں کہ وہ پہلی شخصیت ہیں، جنہوں نے فرائض میں عول کو اختیار فرمایا۔"

یاد رہے یہ وہی شخصیت ہیں جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض یعنی علم میراث کا سب سے بڑا عالم قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "وَأَفْرَضُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ"[2] "اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ میراث کے سب سے بڑے عالم ہیں۔"

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے متعلق ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، قَالَ: أُتِيَ عَلِيٌّ فِي رَجُلٍ مَاتَ وَتَرَكَ أَبَوَيْهِ وَابْنَتَيْهِ وَامْرَأَتَهُ فَقَالَ عَلِيٌّ لِلْمَرْأَةِ: أَرَى ثُمُنَكِ صَارَ تُسْعًا"[3]

"ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ایسے شخص کی بابت دریافت فرمایا گیا جو فوت ہو گیا اور اپنے پیچھے اپنے والدین، دو بیٹیاں اور بیوی چھوڑ گیا، تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عورت سے فرمایا کہ تمہارا آٹھواں حصہ نوواں ہو جائے گا۔"

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"فَقَالَ لَهُ زُفَرُ: يَا أَبَا عَبَّاسٍ، مَنْ أَوَّلُ مَنْ أَعَالَ الْفَرَائِضَ؟ قَالَ: "عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ"[4]

---

1 سعيد بن منصور، سنن سعيد بن منصور (الدار السلفية، 1982)، ص 33
Saeed bin Mansur, Sunan Sa'id bin Mansur (Ad-Dar As-Salafiyyah, 1982), P: 33.

2 ابن ماجة، أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني، سنن ابن ماجة (بيروت: دار إحياء الكتب العربية، 2009)، رقم الحديث:154
Ibn Majah, Abu Abdullah Muhammad bin Yazid Al-Qazwini, Sunan Ibn Majah (Beirut: Dar Ihya Al-Kutub Al-Arabiyyah, 2009), Hadith number 154.

3 سعيد بن منصور، سنن سعيد بن منصور، رقم الحديث:34
Saeed bin Mansur, Sunan Saeed bin Mansur, Hadith number 34.

4 البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي، سنن الكبرىٰ للبيهقي (بيروت: دار الكتب العلمية، 2003ء)، رقم الحديث:12457
Al-Bayhaqi, Ahmed bin Al-Hussein bin Ali, Sunan Al-Kubra li'l-Bayhaqi, (Beirut: Dar Al-Kutub Al-

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے زفر رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا کہ اے ابو عباس! سب سے پہلے کس نے فرائض میں عول کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ جناب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے۔"

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" وَهُوَ قَوْلٌ أَوَّلُ مَنْ قَالَ بِهِ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ، وَوَافَقَهُ عَلَيْهِ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَصَحَّ عَنْهُ هَذَا، وَرُوِيَ عَنْ عَلِيٍّ، وَابْنِ مَسْعُودٍ غَيْرَ مُسْنَدٍ، وَذُكِرَ عَنْ الْعَبَّاسِ وَلَمْ يَصِحَّ، وَصَحَّ عَنْ شُرَيْحٍ"[1]

"حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے عول کا قول اختیار فرمایا اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس پر ان کی موافقت فرمائی، ان سے یہ قول صحیح ثابت ہے، جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے متصل نہیں ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا قول صحیح ثابت نہیں، جبکہ شریح رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح ثابت ہے۔"

- سیدنا عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف:

صحابہ میں کسی کا بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے اختلاف ثابت نہیں سوائے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے، ان سے روایت کیا گیا ہے:

"عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ، «أَتَرَوْنَ الَّذِي أَحْصَى رَمْلَ عَالِجٍ عَدَدًا جَعَلَ فِي مَالٍ نِصْفًا وَثُلُثًا وَرُبُعًا؟ إِنَّمَا هُوَ نِصْفَانِ، وَثَلَاثَةُ أَثْلَاثٍ، وَأَرْبَعَةُ أَرْبَاعٍ»"[2]

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس ذات کے بارے کیا خیال ہے جس نے ریت کے ذروں کی تعداد تک کو شمار کر رکھا ہے، کیا مال میں نصف، ثلث اور ربع (اکٹھا) رکھے گا، جبکہ نصف دو کا آدھا، ثلث تیسرے میں سے تیسرا اور ربع چوتھے میں سے چوتھا ہوتے ہیں؟"

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جسے اللہ نے مقدم کیا، اسے مقدم کیا

Ilmiyah, 2003), Hadith number 12457.

1 ابن حزم، علي بن أحمد بن سعيد بن حزم، المحلى بالآثار (بيروت: دار الكتب العلمية، 2015)، 8: 279
Ibn Hazm, Ali bin Ahmad bin Sa'id bin Hazm, Al-Muhalla bi'l-Athar, (Beirut: Dar Al-Kutub Al-Ilmiyah, 2015), 8:279.

2 سعيد بن منصور، سنن سعيد بن منصور، رقم الحديث: 36
Saeed bin Mansur, Sunan Saeed bin Mansur, Hadith number: 36.

جائے اور جسے موخر کیا اسے موخر رکھا جائے تو عول کی ضرورت نہیں رہتی۔ جناب زفر رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ اللہ نے کسے مقدم رکھا؟ فرمایا کہ ہر وہ صاحبِ فرض مقدم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فرضی حصے سے مکمل محروم نہیں کیا، اگرچہ کبھی ان کا حصہ بڑے حصے سے چھوٹے حصے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اور ہر وہ صاحبِ فرض موخر ہو گا جو اپنے فرضی حصے سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کے لیے باقی مال کے سوا کوئی فرضی حصہ باقی نہیں رہتا۔ جو مقدم ہیں ان میں خاوند بیوی اور ماں ہیں کہ ان کا حصہ بالترتیب نصف، ربع اور ثلث سے ربع، ثمن اور سدس کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ رہے وہ جو موخر ہیں تو ان میں بہنیں اور بیٹیاں ہیں، جن کا حصہ نصف اور ثلثان ہوتا ہے اور جب وہ اپنے درجے کے بھائی کے ساتھ وارث بنتی ہیں تو اپنے فرضی حصے کی وارث نہیں رہتی، بلکہ انہیں باقی بچا ہوا مال ملتا ہے۔[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول اگرچہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے الارواء میں حسن قرار دیا ہے،[2] لیکن اس کے متن میں غرابت ہے۔ ذیل میں چند اشارات پیش کیے جاتے ہیں:

1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہیبت کی وجہ سے اپنی رائے سے رکے رہنا دونوں حضرات سے بعید تر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے مخالف کی رائے قبول کرنے میں سب سے زیادہ معروف ہیں، حتی کہ راہ چلتی خواتین بھی انہیں روک کر ان سے اختلاف کر لیا کرتی تھیں، جیسا کہ حق مہر کی تحدید میں ایک عورت معترض ہوئی تو فرمایا: "أصابت امرأة وأخطأ عمر" "عورت درستی کو پا گئی اور عمر نے خطا کی۔"[3]

---

1 ابن حزم، علي بن أحمد بن سعيد بن حزم، المحلى بالآثار، رقم الحديث: 280
Ibn Hazm, Ali ibn Ahmad ibn Sa'id ibn Hazm, Al-Muhalla bi'l-Athar, Raqm al-Hadith: 280.

2 ألباني، محمد ناصر الدين الألباني، الارواء (بيروت: المكتب الإسلامي - 1985)، 6: 146
Al-Albani, Muhammad Nasiruddin Al-Albani, Al-Irwa' (Beirut: Al-Maktab Al-Islami, 1985), 6: 146.

3 ابن كثير، إسماعيل بن عمر بن كثير، مسند الفاروق لإبن كثير (قاهرة: دار الكتب المصرية، 2009)، 2: 573 ؛ أبو بكر عبد الرزاق بن همام الصنعاني، مصنف عبد الرزاق، (الهند: المجلس العلمي- 1983)، 6: 180
Ibn Kathir, Ismail ibn Umar ibn Kathir, Musnad Al-Farooq by Ibn Kathir (Cairo: Dar Al-Kutub Al-Masriyah, 2009), 2: 573. Abu Bakr Abdur-Razzaq ibn Hammam Al-Sana'ani, Musannaf Abdur-Razzaq (India: Al-Majlis Al-Ilmi, 1983), 6: 180

ایک بار فرمایا: "اللهم غفرانك، كل الناس أفقه من عمر"[1]

"اے اللہ مجھے بخش دے، سب لوگ ہی عمر سے بڑے عالم ہیں۔"

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "لو لا معاذ لهلك عمر"[2] "اگر معاذ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس بات کا امکان نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے چھپا گئے ہوں، کیونکہ وہ تو حبر الامۃ ہیں، تو کیسے ممکن ہے کہ وہ عول کو ظلم خیال کرتے ہوں اور اس پر خاموش بھی رہیں؟

2۔ تقدیم وتاخیر کا بیان کردہ ضابطہ بھی بلا دلیل ہے۔ کسی صاحب فرض وارث کو موخر کرنے کے لیے اس کا فرضی حصے سے تعصیبی حصے کی طرف منتقل ہونا کیونکر دلیل بن سکتا ہے؟ پھر ان کے نقطہ نظر پر یہ اعتراض بھی وارد ہوتے ہیں کہ

(الف)۔ اخیافی بھائی بیٹیوں پر مقدم ہونگے، حالانکہ بیٹیاں انہیں محجوب کر دیتی ہیں۔

(ب)۔ باپ اور دادا کو بھی موخر کیا جائے گا، کیونکہ بعض احوال میں وہ عصبہ ہوتے ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" ولان الاخوات اقوى حالا من الام، والبنات اقوى حالا من الزوج والزوجه بدليل ان البنات يحجبن الزوج والزوجة، من النصف والربع إلى الربع والثمن، والزوجان لا يحجبانهن، والاخوات يحجبن الام والام لا تحجبهن، فكيف يجوز تقديم الضعيف على من هو أقوى منه"[3]

---

1 ابن كثير، إسماعيل بن عمر بن كثير، مسند الفاروق لابن كثير (دار الكتب المصرية2009م)، 2: 573، البيهقي: 7: 233

Ibn Kathir, Ismail ibn Umar ibn Kathir, Musnad Al-Farooq by Ibn Kathir (Dar Al-Kutub Al-Masriyah, 2009), 2: 573. Al-Bayhaqi, 7: 233.

2 ابن أبي شيبه، عبد الله بن محمد بن إبراهيم أبي شيبة العبسي، مصنف ابن ابى شيبة (بدون مدينة النشر: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر، 2008)، 5: 543

Ibn Abi Shaybah, Abdullah ibn Muhammad ibn Ibrahim Abu Shaybah al-Abasi, Musannaf Ibn Abi Shaybah (Publisher: Al-Faruq Modern Printing and Publishing, 2008), 5: 543

3 النووي، محيي الدين بن شرف النووي، المجموع (بدون مدينة النشر: إدارة الطباعة المنيرية، 1347ھ)، 16: 95

Al-Nawawi, Muhyiddin ibn Sharaf al-Nawawi, Al-Majmu' (Publisher: Al-Muniriya Printing Administration, 1347 H), 16: 95.

"چونکہ بیٹیاں خاوند اور بیوی کو نصف اور ربع سے ربع اور ثمن کی طرف محجوب کرتی ہیں، جبکہ خاوند اور بیوی ان کو محجوب نہیں کرتے، اور چونکہ بہنیں ماں کو محجوب کر دیتی ہیں (ثلث سے سدس کی طرف)، جبکہ ماں انہیں محجوب نہیں کرتی، اس دلیل کی بناء پر بہنیں یقیناً ماں سے اقویٰ ہوتی ہیں اور بیٹیاں، خاوند بیوی سے زیادہ قوی ہوتی ہیں، تو ضعیف کو اقویٰ پر مقدم کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟"

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اسی نقطہ نظر پر ابو بکر الجصاص رحمۃ اللہ علیہ نے احکام القرآن[1] میں اور امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے المبسوط[2] میں تعلیقات بیان فرمائی ہیں، جو یقیناً فائدے سے خالی نہیں۔ اس پر تفصیلی بحث دکتور فهد بن عبدالرحمن اليحيٰى نے "العول في الفرائض فقها وحسابا" میں رقم کی ہے۔

5۔ اجماع:

مسئلہ عول پر کثیر اہل علم نے اجماع نقل کیا ہے۔ امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" ولا نعلم اليوم قائلاً بمذهب ابن عباس، ولا نعلم خلافاً بين فقهاء الأمصار في القول بالعول، بحمد الله ومنه."[3]

"آج سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موقف کا کوئی قائل ہمارے علم میں نہیں اور فقہاء الامصار میں عول کے جواز سے متعلق کسی اختلاف سے بھی ہم آگاہ نہیں ہیں۔ (گویا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے) الحمد للہ ومنہ۔"

ابو الحسن ابن القطان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"والعول عند سائر الفقهاء صحيح، وبه قال جماعة الصحابة - رضي الله

---

1 ابن العربي، محمد بن عبد الله أبو بكر بن العربي، أحكام القرآن (بيروت: دار الكتب العلمية، 2003)، 3: 23

Ibn al-Arabi, Muhammad ibn Abdullah Abu Bakr ibn al-Arabi, Ahkam al-Qur'an (Beirut: Dar al-Kutub al-Ilmiyyah, 2003), 3: 23.

2 السرخسي، شمس الدين السرخسي، المبسوط (بيروت: دار المعرفة - 1989)، 7: 562

Al-Sarakhsi, Shams al-Din al-Sarakhsi, Al-Mabsut (Beirut: Dar al-Ma'arifah, 1989), 7: 562.

3 أيضاً: 9: 30

Ibid: 9:30

عنهم - إلا ابن عباس فإن أبطل العول"[1]

"تمام فقہاء کے نزدیک عول صحیح ہے اور اسی پر صحابہ کی جماعت کا فتویٰ ہے، سوائے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے، کیونکہ وہ عول کا ابطال فرماتے ہیں۔"

اس پر تفصیلی بحث "موسوعة الإجماع في الفقه الإسلامي" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جس کے آخر میں یہ نتیجہ بیان کیا گیا ہے: "النتيجة: صحة الإجماع في أنه إذا كان في المسألة عول دخل النقص كل على قدر نصيبه؛ لأن ابن عباس محجوج بالإجماع قبله، وأيضًا حصل الاتفاق بعده، وكان قوله هجره أهل العلم"[2]

6۔ قیاس:

عول کی حجیت پر ایک دلیل قیاسِ صحیح ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی مفلس شخص کی وفات ہو جائے جس کے ذمے کئی ایک حق داروں کا قرض ہو تو اس شخص کی وفات کے بعد اس کا مال قرض خواہوں کے حصص کے مطابق ان میں تقسیم ہو جائے گا۔ اور اگر اس کا مال اس کے ذمے قرض سے کم ہو تو قرض خواہوں کے قرض میں ان کے حصص کے مطابق کمی کر دی جائے گی۔ عول میں بھی اصحاب الفروض کے سہام بڑھ جانے کے سبب ان کے حصص کم کرنا عین قرینِ مصلحت ہے۔[3] کسی قرض خواہ کو پورا اور کسی کو کم دینا ظلم ہو گا، اس کا منصفانہ حل یہ ہے کہ تمام قرض خواہوں کے حصص کے مطابق مال تقسیم ہو۔

اسی طرح اگر کوئی شخص مختلف لوگوں کے لیے ایک تہائی سے زائد مال کی وصیت کر جائے تو جن لوگوں کے لیے وصیت کی گئی ہے ان کو کی گئی وصیت میں ایک تہائی مال کے مطابق اوسطاً کمی کر دی جائے گی۔[4] ان تمام

---

1 الكتامي، علي بن محمد بن عبد الملك، الإقناع في مسائل الإجماع، 2: 106
Al-Kattani, Ali ibn Muhammad ibn Abd al-Malik, Al-Iqna' fi Masail al-Ijma' ,2:106

2 مجموعة من المصنفين، موسوعة الإجماع في الفقه الإسلامي (المملكة العربية السعودية: دار الفضيلة للنشر والتوزيع بالرياض، 2021)، 8: 745
Mujam'a min al-Musannifeen, Mawsu'at al-Ijma' fi al-Fiqh al-Islami, (Al-Mamlakah al-'Arabiyyah as-Sa'udiyyah: Dar al-Fadilah li-Nashr wa-Tawzi' bi-Riyadh, 2021), 8:745.

3 تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے: المغني لابن قدامة، 9: 29
Tafseel ke liye mulaheza farmayen: Al-Mughni by Ibn Qudamah, 9:29

4 أيضاً
Ibid.

دلائل سے عول کی حجیت واضح ہو جاتی ہے، جس پر مزید کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

مسئلہ عول سے متعلق غامدی صاحب کا نقطہ نظر:

جاوید احمد غامدی صاحب کے ہاں مسئلہ عول امت کی اجماعی غلطی ہے اور یہ غلطی تالیفِ کلام کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ ان کے بقول میراث میں فقہاء کے بیان کردہ مسائل کو تسلیم کرنے کے نتیجے میں انسان دین وایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اپنی کتاب میزان کی تدریس کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس (مسائلِ عول وغیرہ) کو ماننے کا نتیجہ تو یہ ہے آپ دین ایمان سب سے جائیں گے۔"[1] نیز فرماتے ہیں:

"اس قانون کو بالاجماع غلط سمجھا گیا ہے، اور یہ قرآن مجید پر ایک تہمت ہے جس طرح سے سمجھا گیا ہے۔"[2]

"قرآن کی عربی ایسی زبان ہے کہ آدمی جانتا ہو تو کوئی ابہام نہیں ہے، نہ جانتا ہو تو پھر وہی کچھ ہے جو ابھی آپ دیکھیں گے۔"[3]

غامدی صاحب کے نزدیک حصص کی تقسیم کیسے ہوگی، اپنی کتاب میزان میں قانونِ معیشت کے تحت رقم طراز ہیں:

﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾[4]

"اور اگر میت کی اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے ترکے کا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کا حصہ ایک تہائی ہے، اور اگر میت کے بہن بھائی ہوں تو ماں کے لیے وہی چھٹا حصہ ہے، جب کوئی وصیت مرنے والے نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض اگر اس نے چھوڑا ہو، وہ ادا کر دیا جائے۔"

---

1 (Meezan Class 144 | Taqseem e Warasat (2) - Javed Ahmad Ghamidi 88-A, 08-04-2004 https://www.youtube.com/watch?v=VqHX5P2h3qo&t=3s 12:20)

2 ___do___ 14:55

3 ___do___ 17:20

4 النساء: 11

Al-Nisa:11

اولاد کے بعد یہ اب والدین کے حصے بیان ہوئے ہیں:

﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ﴾ یہ جملہ ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً﴾ اور ﴿وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً﴾ پر نہیں، بلکہ اس پورے حکم پر عطف ہوا ہے جو اوپر اولاد کے لیے بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اس میں عطف اب جمع کے لیے نہیں ہو گا، اسے استدراک کے لیے مانا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ کہ ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ میں یہ بات تو بیان ہوئی ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو گا، لیکن یہ کتنا ہو گا، اسے متعین نہیں کیا گیا۔ یہ اسی طرح کا اسلوب ہے، جس طرح مثال کے طور پر ہم اپنی زبان میں یہ کہیں کہ ـــــ "یہ روپے بچوں کے لیے ہیں، لڑکوں کو لڑکیوں سے دونا دیجیے، اور اس میں سے آدھی رقم آپ کے ابا کے لیے ہے" ـــــــ ان جملوں کو دیکھیے، ان سے قائل کا مدعا بالکل واضح ہے۔ جو شخص بھی زبان آشنا ہو گا، وہ ان سے یہی مطلب سمجھے گا کہ روپے درحقیقت بچوں کے لیے دیئے گئے ہیں، اس لیے بات اگر پہلے دو جملوں پر ہی ختم ہو جاتی تو ساری رقم لڑکوں اور لڑکیوں میں اسی نسبت سے تقسیم کر دی جاتی جو ان جملوں میں بیان ہوئی ہے، لیکن قائل نے اس کے بعد چونکہ آدھی رقم ابا کو دینے کے لیے کہا ہے، اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ابا کا حصہ پہلے دیا جائے اور باقی جو کچھ بچے، وہ اس کے بعد بچوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہم نے اوپر اولاد کے حصوں کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً﴾، ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ سے استثنا اور اسی کے ایک پہلو کی وضاحت ہے۔ ہماری یہ بات اگر صحیح ہے تو اسے پھر ﴿وَلِأَبَوَيْهِ﴾ کی طرح اپنے مقام پر مستقل نہیں مانا جا سکتا۔ اس کا حکم وہی ہونا چاہیے جو ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ کا ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے، جس طرح مثلاً ہم کہیں کہ ـــــ "یہ ساری رقم زید، عثمان اور علی کے لیے ہے اور اس میں ان کا حصہ بالکل برابر ہے، لیکن اگر عثمان اور علی ہی ہوں تو پوری رقم کا دو تہائی عثمان اور ایک تہائی علی کو دیجیے، اور اس میں سے دس روپے ہماری بہن کو دے دیجیے گا" ـــــ ان جملوں پر غور کیجیے، ان میں اگرچہ زید کی عدم موجودگی میں عثمان اور علی کو بالترتیب پوری رقم کا دو تہائی اور ایک تہائی دینے کے لیے کہا گیا ہے، لیکن ان کے خاتمہ پر جو استدراک ہوا ہے، اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس رقم میں سے پہلے دس روپے بہن کو دیے جائیں، اور اس کے بعد جو کچھ بچے، وہ عثمان اور علی میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

یہ اسلوب آیۂ زیر بحث میں بھی ہے۔ چنانچہ یہ اگر ملحوظ رہے تو اس بات کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی

کہ ﴿وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ کے بعد والدین اور زوجین کے جو حصے حرف 'و' سے اولاد کے حصوں پر عطف ہوئے ہیں، وہ سب لازماً پہلے دیے جائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ بچے گا، صرف وہی اولاد میں تقسیم ہو گا۔ لڑکے اگر تنہا ہوں تو انہیں بھی یہی ملے گا اور لڑکے اور لڑکیاں، دونوں ہوں تو ان کے لیے بھی یہی قاعدہ ہو گا۔ اسی طرح میت کی اولاد میں اگر تنہا لڑکیاں ہی ہوں تو انہیں بھی اس بچے ہوئے ترکے ہی کا دو تہائی یا آدھا دیا جائے گا، ان کے حصے پورے ترکے میں سے کسی حال میں ادا نہ ہوں گے۔

آیت کا صحیح مدعا یہی ہے۔ جو شخص بھی ﴿وَلِأَبَوَيْهِ﴾ میں حرف 'و' اور ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً﴾ میں حرف 'ف' کی دلالت کو سمجھتے ہوئے اس آیت کو پڑھے گا، کلام کا یہ مدعا بغیر کسی تکلف کے اس پر واضح ہو جائے گا۔[1]

جاوید احمد غامدی صاحب کی آراء پر ملاحظات:

محترم غامدی صاحب کا موقف ہمارے سامنے ہے، ان کے موقف کی تفہیم کے لیے ہمارے پیش نظر ان کی کتاب میزان اور اس پر ان کی تدریس ہے، جو کہ انٹرنیٹ پر بآسانی دستیاب ہے۔ ذیل میں غامدی صاحب کی آراء سے متعلق چند ملاحظات پیش کیے جا رہے ہیں۔

مسئلہ عول پیدا ہونے کی وجہ عربی زبان سے ناواقفیت؟

محترم جاوید احمد غامدی صاحب کے نزدیک مسئلہ عول قرآن مجید کی عربی سے ناآشنائی کے سبب پیدا ہوا ہے، ان کا خیال ہے کہ تمام فقہاء قرآن مجید میں جملے کی تالیف کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ میزان کی تدریس کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "قرآن کی عربی ایسی زبان ہے کہ آدمی جانتا ہو تو کوئی ابہام نہیں ہے، نہ جانتا ہو تو پھر وہی کچھ ہے جو ابھی آپ دیکھیں گے۔"[2] نیز فرماتے ہیں: "میرے نزدیک یہ مسئلہ کہاں سے پیدا ہوا ہے، (وہ یہ ہے کہ) جملے کی تالیف کو نہیں سمجھا گیا۔"

تمام صحابہ و تابعین، فقہاء و آئمہ، محدثین و مفسرین کیا سبھی عربی زبان سے نابلد تھے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو

---

1 غامدی، جاوید احمد، میزان (لاہور: المورد، 2011ء)، ص: 519-520

Ghamidi, Javed Ahmad. Mizan (Lahore: Al-Mawrid, 2011), pp. 519-520.

2 (Meezan Class 144 | Taqseem e Warasat (2) - Javed Ahmad Ghamidi 88-A, 08-04-2004 https://www.youtube.com/watch?v=VqHX5P2h3qo&t=3s 17:20)

اعتراض اور طعن پوری امت پر کیا جارہا ہے، وہ خود انہی پر وارد ہوتا ہو؟ جیسا کہ ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾ میں ﴿مَا تَرَكَ﴾ کی دلالت کا مسئلہ ہے۔

'ماترک' کی دلالت:

محترم غامدی صاحب اپنے نقطہ نظر کے بیان میں اس قدر منہمک ہوئے کہ دوسروں کو عربی زبان سے ناآشنائی کا طعنہ دیتے دیتے خود قرآن مجید کے سادہ سے عربی الفاظ کا سادہ سا مفہوم بھی نہ جان پائے۔ اور وہ الفاظ ہیں ﴿مَا تَرَكَ﴾، جو کہ اس آیت کریمہ میں موجود ہیں:

﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾[1] "اگر عورتیں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے دو تہائی ہے جو اس (میت) نے چھوڑا۔"

یہاں 'ما' موصولہ ہے جس کا مطلب ہے 'جو' اور 'ترک' فعل ماضی، واحد مذکر غائب ہے، جس کا معنی ہے اس نے چھوڑا، یعنی میت نے۔ یہ اس قدر سادہ بات ہے کہ مدرسے کا پہلی جماعت کا طالب علم بھی اسے بآسانی سمجھ سکتا ہے، لیکن برا ہو اس عُجب اور خود پسندی کا جو قرآن مجید کے سادہ سے الفاظ اور ان کی سادہ سی تعبیر بھی انسان سے اوجھل کر دینے کا باعث بنتی ہے۔ وہ اللہ جو ﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾ کے الفاظ سے ورثاء کے حصص سے قبل وصیت اور قرض کی ادائیگی کا حکم دے رہا ہے، اس کے لیے کیا مشکل تھی کہ ورثاء میں بھی کوئی ترتیب بیان کر دیتا؟

آیت کریمہ میں مذکور الفاظ ﴿مَا تَرَكَ﴾ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ بیٹیوں کا حصہ کل مال میں سے ہوگا جو میت نے چھوڑا ہے، نہ کہ بقیہ مال سے۔ اگر بیٹیوں کا حصہ والدین اور خاوند بیوی کو دینے کے بعد ادا کرنا ہوتا تو ﴿مَا تَرَكَ﴾ کے الفاظ نہ ہوتے۔ گویا غامدی صاحب کا نقطہ نظر قرآن مجید کی صریح نص کے خلاف ہے۔ اور عربی سے ناآشنائی کا وہ طعنہ جو پوری امت کے فقہا کو دیا جارہا تھا، خود انہی پر پلٹ آیا۔

---

1 النساء: 11

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾ اور ﴿إِنْ كَانَ لَهُ وَلَد﴾ کی دلالت

غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ﴾ یہ جملہ ﴿ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً ﴾اور ﴿ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً﴾ پر نہیں، بلکہ اس پورے حکم پر عطف ہوا ہے جو اوپر اولاد کے لیے بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اس میں عطف اب جمع کے لیے نہیں ہو گا، اسے استدراک کے لیے مانا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ میں یہ بات تو بیان ہوئی ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو گا، لیکن یہ کتنا ہو گا، اسے متعین نہیں کیا گیا۔''[1]

گویا غامدی صاحب نے اولاد، والدین اور خاوند بیوی سے متعلق میراث کے تمام ضابطوں کو ایک جملہ قرار دیا ہے، جس میں 'وَلِأَبَوَيْهِ' کے بعد بیان ہونے والے حصص ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾ کے ساتھ بیان ہونے والے حصص سے استدراک ہیں۔ ایسا ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زبان و بیان کے اس جھول کو بھی تسلیم کر لیا جائے جو ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾ اور ﴿إِنْ كَانَ لَهُ وَلَد..... فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَد..... إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ..... فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ..... إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ..... فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ﴾ میں پیدا ہوتا ہے۔ 'وَلِأَبَوَيْهِ' کے عطف کو استدراک کے لیے ماننے سے جملہ یوں بنے گا:

''اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے حکم دیتا ہے کہ بیٹوں کو بیٹیوں سے دوگنا دو۔۔۔ اور والدین میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا ہے اگر اولاد موجود ہو۔''

گویا اولاد کے لیے ایک حکم دیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی والدین اور زوجین سے متعلق حکم میں اولاد کی موجودگی اور عدم موجودگی کی شرط عائد کی جا رہی ہے، یعنی استدراک ماننے کی صورت میں انتہائی غیر بلیغ اور متناقض قسم کے جملے بن جائیں گے۔ اس صورت میں جملے کچھ یوں ہونگے: ''مال بچوں کے لیے ہے، اگر بچے ہوں تو والدین کا چھٹا ہے۔''، یہ جملہ بھی ملاحظہ فرمائیے: ''مال اولاد کے لیے ہے، اگر اولاد نہ ہو تو ماں کا تیسرا حصہ ہے۔''، ایک اور جملہ دیکھیے: ''مال اولاد کے لیے ہے، اگر اولاد نہ ہو تو خاوند کا نصف ہے''، یہ جملہ بھی لیجیے اور زبان آشنائی پر حظ اٹھائیے:

---

1 جاوید احمد غامدی، میزان، ص:519

Javed Ahmed Ghamedi, Meezan, S: 519

"مال اولاد کے لیے ہے، اگر اولاد ہو تو خاوند کا ربع ہے۔"

ان جملوں کو استدراک مان کر اکٹھا خیال کیا جائے تو زبان و بیان تماشا بن جائیں گے۔ زبان آشنا شخص اس غیر بلیغ اور متناقض قسم کے بیان پر اناللہ ہی پڑھے گا کہ اسے زبان دانی، زبان آشنائی، تالیفِ کلام سے آگہی قرار دیا جارہا ہے اور باقی پوری امت پر عربی زبان سے ناآشنائی کا فتویٰ صادر کیا جارہا ہے۔

ادھوری مثال:

غامدی صاحب عول کا رد کرتے ہوئے اپنے موقف کی تفہیم ایک مثال کے ذریعے فرماتے ہیں، لکھتے ہیں:

"یہ اسی طرح کا اسلوب ہے، جس طرح مثال کے طور پر ہم اپنی زبان میں یہ کہیں کہ یہ روپے بچوں کے لیے ہیں، لڑکوں کو لڑکیوں سے دونا دیجیے، اور اس میں سے آدھی رقم آپ کے ابا کے لیے ہے۔"[1]

ہمارے نزدیک یہ ایک ناقص اور ادھوری مثال ہے، جس میں کچھ الفاظ بیان ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اس مثال کو یوں ہونا چاہیے: "یہ روپے آپ کے بچوں کے لیے ہیں، لڑکوں کو لڑکیوں سے دونا دیجیے، اور اس میں سے آدھی رقم آپ کے ابا کے لیے ہے، اگر آپ کے بچے موجود ہوں۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں 'إن كان له ولد' کے الفاظ نصاً موجود ہیں۔ یہ الفاظ اگر داخل کر دیے جائیں تو غامدی صاحب کے پورے بیانیے کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ روپے بچوں کو دیے جائیں اور ان کی موجودگی اور عدم موجودگی کی شرط بھی عائد کی جائے؟ اس کا حل سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ تمام جملوں کو ان کی مستقل الگ حیثیت میں سمجھا جائے، جو کہ صحابہ کرام سے لے کر آج تک امت کا اجماعی نقطہ نظر ہے۔

کیا استدراک اور استثنا اصل حکم سے بڑھ سکتے ہیں؟

جب کسی بات سے استثنا یا استدراک کیا جاتا ہے تو وہ اصل سے کم اور چھوٹا ہوتا ہے، جیسے آپ کہیں کہ "جاءني القوم إلا زيدا" "سب لوگ میرے ہاں آئے، سوائے زید کے۔" قرآن مجید میں ہے:

---

1 جاوید احمد غامدی، میزان، ص: 519

Javed Ahmed Ghamedi, Meezan, S: 519

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ﴾[1]

"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے۔"

ان مثالوں میں زید اور ابلیس اصل حکم سے مستثنیٰ ہیں اور وہ اصل حکم سے خارج ہیں اور قلیل ہیں۔ غامدی صاحب کے نزدیک ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾ اصل حکم ہے اور والدین اور زوجین کے سے متعلق حکم اس اصل سے استدراک یا استثناء ہے۔ اس میں لازماً والدین اور زوجین کے حصص سے اولاد کے حصص زیادہ ہونے چاہییں، جیسا کہ زبان و بیان کا عام اصول ہے، لیکن غامدی صاحب کی بیان کردہ تقسیم کار کے مطابق بیشتر صورتوں میں اولاد کا حصہ استدراک کے بعد بیان کیے گئے والدین اور زوجین کے حصص سے کم رہ جاتا ہے، جو کہ نہ صرف زبان و بیان کے اسالیب سے متصادم ہے، بلکہ عقلاً بھی محال ہے۔ مثال کے طور پر میت اپنے پیچھے ماں، باپ، خاوند اور دو بیٹیاں چھوڑ کر فوت ہوئی تو اجماع امت کے مطابق دو بیٹیوں کا حصہ 8 بنتا ہے، اور دیگر سب کا حصہ 7 ہے۔ جبکہ غامدی صاحب کی تقسیم کے مطابق اگر بیٹیوں کو باقی مال سے دو تہائی دیں تو وہ 3.33 بنتا ہے، اور دیگر سب کے حصے 7 ہونگے۔ گویا استدراک اور استثنا اصل سے بڑھ گیا۔

		اجماع امت کے مطابق		غامدی صاحب کے مطابق
		12	15	12
1/6	ماں	2	2	2
1/6	باپ	2	2	2
1/4	خاوند	3	3	3
2/3	دو بیٹیاں	8	8	3.33

یہ صرف ایک مثال ہے، ورنہ کئی ایک مسائل میں ایسے ہی جھول دیکھنے میں آتے ہیں۔

اقویٰ رشتے، میراث میں مؤخر کیونکر؟

قرآن مجید کا اسلوب سامنے ہو تو یہ بات واضح طور پر کھل کر سامنے آتی ہے کہ اولاد تمام رشتہ داروں میں

1 البقرة:34

اقویٰ ہے۔ اور تقریباً پوری دنیا میں یہی اصول ہے۔ یہی نقطہ نظر تمام فقہا کا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اولاد والدین کو ان کے بڑے حصے ثلث اور عصبہ سے سدس کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔[1] نیز اولاد میاں اور بیوی کو بھی ان کے بڑے حصے یعنی نصف اور ربع سے چھوٹے حصے یعنی ربع اور ثمن کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔[2] مزید یہ کہ حواشی بھی اولاد کی موجودگی میں محروم ہوتے ہیں۔[3]

محترم جاوید احمد غامدی صاحب فرماتے ہیں: اولاد کا حصہ ہر حال میں والدین اور بعد میں جو (خاوند) بیوی کا حصہ بیان ہوا، دینے کے بعد دیا جائے گا۔[4]

غامدی صاحب کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق میراث تقسیم ہو تو کمزور رشتے قوی رشتوں پر مقدم ہوں گے، جو کہ قرآن وسنت کی نصوص، عقل عامہ اور پوری دنیا میں جاری ضابطوں کی روشنی میں درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمادیا ہے کہ ﴿آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا﴾[5] تمہارے آباء اور بیٹوں سے متعلق تم نہیں جانتے کہ نفع کے اعتبار سے کون تمہارے زیادہ قریب ہے۔ گویا رشتوں میں خود ساختہ تقدیم وتاخیر، کمی بیشی، اتار چڑھاؤ اور ہر طرح کے ظلم سے منع کر دیا گیا ہے۔

حدیثِ نبوی ﷺ کی خلاف ورزی:

قرآن مجید جس طرح "ما ترك" کے الفاظ کے ساتھ اپنا مفہوم واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ ایک سے زائد بیٹیوں کا حصہ کل مال کا دو تہائی ہے، عین یہی مفہوم حدیث مبارکہ سے بھی ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے دو بیٹیوں کو کل مال میں سے دو تہائی دلایا، جبکہ غامدی صاحب ماں، باپ اور خاوند، بیوی کو حصہ ادا کرنے کے بعد بقیہ مال سے

---

1 النساء:11
Al-Nisa:11

2 النساء:11
Al-Nisa:11

3 النساء:176
Al-Nisa:176

4 (Meezan Class 144 | Taqseem e Warasat (2) - Javed Ahmad Ghamidi 88-A, 08-04-2004 https://www.youtube.com/watch?v=VqHX5P2h3qo&t=3s 45:46)

5 النساء:11
Al-Nisa:11

دو تہائی دینے کے قائل ہیں، جو صراحتاً حدیث مبارکہ کے خلاف ہے۔ حدیث مبارکہ میں بیان ہوا ہے:

"جَاءَتْ امْرَأَةُ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ بِابْنَتَيْهَا مِنْ سَعْدٍ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، هَاتَانِ ابْنَتَا سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ، قُتِلَ أَبُوهُمَا مَعَكَ يَوْمَ أُحُدٍ شَهِيدًا، وَإِنَّ عَمَّهُمَا أَخَذَ مَالَهُمَا، فَلَمْ يَدَعْ لَهُمَا مَالًا وَلَا تُنْكَحَانِ إِلَّا وَلَهُمَا مَالٌ، قَالَ: «يَقْضِي اللَّهُ فِي ذَلِكَ» فَنَزَلَتْ: آيَةُ الْمِيرَاثِ، فَبَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى عَمِّهِمَا، فَقَالَ: «أَعْطِ ابْنَتَيْ سَعْدٍ الثُّلُثَيْنِ، وَأَعْطِ أُمَّهُمَا الثُّمُنَ، وَمَا بَقِيَ فَهُوَ لَكَ»"[1]

"سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ سعد رضی اللہ عنہ سے اپنی دو بیٹیاں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ دونوں سعد بن الربیع کی بیٹیاں ہیں، ان کا والد آپ کے ساتھ احد کے دن (جنگ میں) شہید ہو گیا ہے، اور ان کے چچا نے ان کا سارا مال لے لیا ہے، اور ان کے لیے کوئی مال نہیں چھوڑا، اور مال کے بغیر ان کی شادی نہیں ہو سکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس بارے میں اللہ تعالی فیصلہ فرمائے گا۔ تو میراث والی آیت (سورۃ النساء کی آیت 11، 12) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بچیوں کے چچا کو پیغام بھیجا کہ سعد کی بیٹیوں کو دو تہائی دے دو اور انکی ماں کو آٹھواں حصہ دے دو اور جو باقی بچے گا وہ تیرے لیے ہے۔"

اس حدیث مبارکہ سے واضح ہے کہ بیٹیوں کا حصہ کل مال کا دو تہائی ہے نہ کہ بقیہ مال کا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد رضی اللہ عنہ کے بھائی کو یہ نہیں فرمایا کہ سعد رضی اللہ عنہ کی بیوہ کو آٹھواں حصہ دے کر جو باقی بچے اس میں سے دو تہائی سعد رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں کو دے دو، بلکہ یہ فرمایا کہ سعد کی بیٹیوں کو دو تہائی اور بیوی کو آٹھواں حصہ دے دو، جو کہ واضح ہے کہ کل ترکہ میں سے دو تہائی اور کل ترکہ میں سے آٹھواں حصہ ہے، پھر فرمایا کہ جو باقی بچے وہ تیرے لیے ہے۔ غامدی صاحب کے مطابق پہلے بیوی کو ثمن دے کر پھر بیٹیوں کو دو تہائی دینا ہو گا، لیکن یہاں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ذکر ہی بیٹیوں کا فرمایا ہے اور باقی مال کی کوئی بات تک نہیں فرمائی، بلکہ پہلے بیٹیوں کو ثلثان اور

1 التِّرْمِذِي، محمد بن عيسىٰ جامع الترمذي (بدون مدينة النشر: دار الغرب الإسلامي، 1996)، جامع الترمذي، رقم الحديث: 2092

At-Tirmidhi, Muhammad ibn 'Isa. Jami' at-Tirmidhi. (Beirut: Dar al-Gharb al-Islami, 1996), Jami' at-Tirmidhi, Hadith number: 2092.

بیوی کو ثمن دینے کے بعد باقی مال کی بات کی ہے کہ وہ تیرے لیے ہے۔ یہی بات اللہ تعالی نے قرآن مجید فرقان حمید میں بیان فرمائی ہے کہ بیٹیاں اگر دو یا زائد ہوں تو ﴿فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾ ان کے لیے اس میں سے دو تہائی ہے جو اس (میت) نے چھوڑا ہے۔ یعنی کل مال کا دو تہائی بیٹیوں کو ملے گا۔ کیونکہ "ثُلُثَا" کی اضافت "مَا تَرَكَ" کی طرف ہے جس کا واضح معنی ہے کہ اس کا دو تہائی جو اس نے چھوڑا ہے، نہ کہ اس کا دو تہائی جو اس میت کے وارثوں نے باقی چھوڑا۔

اپنے فہم سے مخالف روایات کا انکار:

روایات کو پرکھنے کا انداز یہ ہے کہ انہیں روایتی و درایتی انداز سے پرکھا جائے، اسانید پر بحث ہو، رجال پر تحقیق پیش کی جائے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غامدی صاحب بالعموم اپنے فہم سے مخالف روایت کی تحقیق کے بجائے، انہیں ماننے سے ہی انکار کر دیتے ہیں، جیسا کہ عول کے مسئلہ پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت شدہ روایات سے متعلق فرماتے ہیں: "اس طرح کی روایات سے آنکھیں بند کر لینی چاہییں۔" نیز فرماتے ہیں کہ عول سے متعلق یہ روایات قصے کہانیاں ہیں۔[1]

یہ انکارِ حدیث کا بیانیہ ہے۔ انتہائی غیر ذمہ دارانہ اور غیر علمی رویہ ہے جسے علم کی دنیا میں سخت مذموم خیال کیا جاتا ہے۔ یہ تحقیق کے میدان میں اترنے کے بجائے فرار اور کنارہ کشی ہے۔ یہ گویا اس بات کا اظہار ہے کہ مجھے ہر حال میں اپنی بات کہنا ہے، بھلے صحیح روایات کا قتل ہی کرنا پڑے۔

کیا فقہاء نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول گھڑا؟

غامدی صاحب عول سے متعلق روایات کو قصے کہانیاں تو قرار دیتے ہی ہیں، ساتھ ہی ساتھ فقہاء کرام پر الزام بھی عائد فرماتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بعد میں عول کا مسئلہ پیدا ہوا، فقہاء نے عول کے تحت مسئلہ کی تقسیم کر دی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو درمیان میں لے آئے ہیں۔[2] بلا دلیل الزام تراشی کا یہ رویہ کس قدر نامناسب اور غیر علمی ہے۔ اسانید کی موجودگی میں اس طرح کا بیان کوئی صاحبِ علم و دانش کیونکر دے سکتا ہے!!!

---

1 (Meezan Class 144 | Taqseem e Warasat (2) - Javed Ahmad Ghamidi 88-A, 08-04-2004 https://www.youtube.com/watch?v=VqHX5P2h3qo&t=3s 46:30)

2 ___do___ (46:45)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب الفاظ:

اپنی کتاب میزان کی تدریس فرماتے ہوئے محترم غامدی صاحب فرماتے ہیں:

"انہوں (ابن عباس رضی اللہ عنہما) نے کہا کہ خدا کی قسم یہ غلط ہے، یہ الفاظ ہیں، خدا کی قسم یہ جو کچھ ہوا ہے غلط ہوا ہے، روایت یہ بیان کی جاتی ہے، میں صحیح یا غلط کی بات نہیں کر رہا۔۔۔۔ جس خدا نے ریت کے ذرے گن لیے ہیں، تم لوگ یہ کہتے ہو کہ دو بٹا تین، ایک بٹہ تین اور ایک بٹہ چار کو جمع نہیں کر سکتا۔ یہی الفاظ ہیں، بالکل بعینہ یہی الفاظ ہیں۔"[1]

محترم غامدی صاحب جن الفاظ پر بار بار زور دے کر فرما رہے ہیں، راقم السطور کو تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکے۔ اگر کسی روایت میں یہ الفاظ ہوں تو ازراہِ کرم راقم کو آگاہ فرما دیں۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا کوئی موقف نہیں تھا؟

غامدی صاحب فرماتے ہیں: "عطا رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے یہ کہا کہ حضرت پھر آپ نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کیوں نہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ بڑی ہیبت ناک شخصیت تھی ان کی، میں ڈرتا رہا، عرض نہ کر سکا۔ روایت یہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب کیا ہو گا؟ انہوں نے کہا کہ اب کیا ہونا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ان کے فیصلے کے بعد ہماری بات کون سنے گا؟ لیکن یہ غلط ہے، صحیح کیا ہے یہ نہیں معلوم، لیکن یہ غلط ہے۔"[2]

غامدی صاحب کی گفتگو سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اپنا کوئی موقف نہیں تھا، وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر تو نقد فرما رہے تھے، لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ صحیح کیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، گذشتہ سطور میں محلیٰ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تقدیم و تاخیر کا موقف بیان ہو چکا ہے، نیز اس پر اہل علم کا جواب بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

کیا "مسئلہ رد" قرآن پر اضافہ نہیں؟

قرآن مجید کے بیان کردہ حصص میراث کے مسائل کا بنیادی حل ہیں، یعنی ان کی بنیاد پر ہر ہر مسئلے کو حل کیا

---

1 ___do___ (46:45)
2 ___do___ (44:35)

جائے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ آخری حل ہیں۔

اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے "مسئلہ رد" کو وصیت وغیرہ کے ذریعے قبول کر لیا گیا ہے اور "مسئلہ عول" کو رد کر دیا گیا ہے۔ اگر قرآن مجید کے بیان کردہ حصص ہر مسئلے کا آخری حل ہیں تو جہاں عول کو قبول نہیں کیا گیا وہاں رد کو بھی نہیں قبول کیا جانا چاہیے، لیکن ایسا نہیں کیا جاتا۔ باقی بچا ہوا مال ورثاء کو لوٹانا بھی تو قرآنی حصص پر اضافہ ہی ہے۔

اسے یوں جاننا چاہیے کہ جیسے قرآن مجید میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا تذکرہ ہے، اب اس کی وضاحت قرآن مجید میں موجود نہیں کہ کندھے سے کاٹا جائے گا یا کلائی سے، یہ نبی کریم ﷺ کی حدیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فہم سے معلوم ہو گا۔ اسی طرح زانی کو کوڑے مارنے کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے، لیکن کس چیز سے مارا جائے گا جیسے بہت سے تطبیقی احکام قاضی اور جج پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ ایسے ہی عول سے متعلق قرآن مجید میں اصول بیان کر دیے گئے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ جن لوگوں کی زبان کے مطابق قرآن نازل ہوا تھا، انہوں نے ان اصولوں کو کیسے سمجھا۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور چودہ صدیوں تک امت کو سمجھ نہیں آیا تو گویا قرآن مجید غیر بلیغ کلام ہے جو اپنے مخاطبین کو بات سمجھانے سے قاصر رہا۔

خلاصہ:

دین کے بنیادی مآخذ سے وابستگی کا نام روایت پسندی ہے، جبکہ بدلتے احوال میں آزادانہ رائے قائم کرنے اور دینی مآخذ کو اپنی رائے کے مطابق ڈھالنے کو جدیدیت کہا جاتا ہے۔ یہ چونکہ بنیادی فکر کا مسئلہ ہے، اس لیے اس کے اثرات پوری زندگی میں رونما ہوتے ہیں، حتیٰ کہ فقہی تعبیرات میں بھی اس کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ مسئلہ عول پر پوری امت کا اجماع ہے جس کی اصل قرآن وسنت میں بھی موجود ہے؛ اسی پر صحابہ کرام کا عمل رہا؛ بعد کے ادوار میں بھی اسے حجت سمجھا جاتا رہا یوں اسے تواترِ عملی کا مرتبہ حاصل ہو گیا؛ نیز قیاسِ صحیح بھی اسی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے برعکس آزادانہ رائے قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ پوری امت کے اجماع کو ترک کر کے ایسا نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے، جو نہ صرف قرآن وسنت کی صریح نصوص سے متصادم ہے، بلکہ اجماعِ امت، اقوال صحابہ وتابعین اور عقلِ عامہ کے بھی خلاف ہے۔